افکار

(۱)

فاطمینِ مصر

فاطمین کے مذہب و عقائد کا اب تک نام ہی سنا تھا، یا اپنے ہاں کی کتابوں میں اُن کا ذکر پڑھا تھا، برائیوں اور گمراہیوں کے ساتھ کچھ حالات اُن کے تاریخِ مصر میں بھی سرسری پڑھ لیے تھے، اور دو ایک کتابیں اُردو میں بھی اُن کے عقائد اور ردِ عقائد پر نظر سے گزر گئی تھیں اور بہ حیثیت مجموعی اب تک اثر یہی پڑا تھا کہ خدا جانے کس درجہ کج رائے اور گمراہ یہ فرقہ ہے، اور ایسے فرقِ ضالہ کو اُمتِ اسلام میں کوئی ادنیٰ درجہ بھی دینا اسلام پر ظلم کرنا ہے۔

اتفاق سے ابھی چند مہینے ہوتے اُن کی ایک اصل کتاب عربی میں ہاتھ آگئی۔ مختصر نام ہے "دعائم الاسلام" اور پورا اور طویل نام اگر پڑھیئے تو وہ ہے: دعائم الاسلام و ذکر الحلال والحرام والقضایا والاحکام عن اہلِ بیت رسول اللہ علیہ وعلیہم افضل السلام۔ کتاب اُن کے ایک مستند و قدیم، فاضل و امامِ فن قاضی ابی حنیفہ النعمان بن حیّون التمیمی المغربی (متوفی ۳۶۲ھ) کی تصنیف ہے، اور دو جلدوں میں ہے۔ پیشِ نظر پہلی جلد ہے۔ اسے ڈاکٹر آصف فیضی (بمبئی والے) نے ایڈٹ کر کے کوئی تین سال ہوئے شائع کیا ہے، ضخامت عربی نسخ کے ٹائپ میں ۴۵۴ صفحہ کی ہے، کتاب فقہ و ارکانِ اسلام پر ہے اور ان کی فقہ تمام تر حدیث ہی پر مبنی اور اسی سے ماخوذ ہے۔ البتہ حدیث کے مفہوم میں ان کے ہاں وسعت ہے یعنی رسولؐ کے ساتھ اہلِ بیتِ رسول کے بھی اقوال اس میں شامل ہیں۔ ترتیبِ کتاب بالکل ہم ہی لوگوں کی کتابوں کی طرح ہے۔ مختصر فہرست عنوانات ملاحظہ ہو۔ کتاب[1] ولایت (وجوب ولایت اللہ پر ہے)، کتاب[2] الطہارۃ۔ کتاب[3] الصلوٰۃ۔ کتاب[4] الجنائز۔ کتاب[5] الزکوٰۃ۔ کتاب[6] الصوم

والاعتکاف. کتاب الحج، کتاب الجہاد، اور پھر ہر باب کے تحتانی عنوان بھی متعدد ہیں۔ دوسری جلد کی بھی فہرست اسی کے دیباچہ میں دے دی ہے۔ اس کے بھی عنوانات ۲۶ ہیں۔ کتاب البیوع، کتاب الاطعمہ، کتاب النکاح۔ کتاب الطلاق وغیرہا۔

یہ حدیثیں ہم اہلِ سنت کے معیار سے کس درجہ کی ہیں، کس حد تک حُجّت شرعی کا کام دے سکتی ہیں۔ وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات سے یہاں بحث نہیں، ظاہر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ہمارے اُن کے بڑا اختلاف ہوگا۔ اختلافات نہ ہوتے تو فاطمیہ کا ایک الگ فرقہ ہی جمہورِ اُمت سے کٹ کر کیوں قرار پاتا۔ اور مسئلے بھی اپنی جگہ اہم ہیں، اور اختلافات کو کالعدم قرار دے دینا ہرگز مقصود نہیں، لیکن اہم ترین سوال تو توحید و رسالت ہی کا ہے اور بنیادی مسئلے صرف یہی دو ہیں۔ اس کا اعتراف اس فرقہ کو بھی ہے، اور ان دو اصلوں سے وہ ذرا ہٹنا نہیں چاہتا۔ اختلافات جو کچھ ہیں وہ تفصیلات و جزئیات میں ہیں۔ اور زیادہ چھان بین کی جائے تو خود اہلِ سنّت کے اندر قدیم اور جدید کتنے فرقے نکلیں گے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرار، وحدتِ اُمّت کے قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ وحدت کلمہ ہی کو معیارِ اسلام رکھا جائے اس کے ردّ و قبول پر حکم کفر و اسلام کا لگایا جائے، اور اختلافات تعبیرات کے تلخ ذائقہ کو جوں توں برداشت کیا جائے۔ وحدت کلمہ بڑی چیز، بہت بڑی چیز۔ سب سے بڑی چیز ہے۔ اس کی عظمت دل میں پوری طرح اُتر جائے۔ تو دوسرے سارے مسئلے نسبتہً خفیف ہی نظر آنے لگیں گے، اور تحزب دکہ اسی کا صحیح نام 'فرقہ واریت' ہے۔ جسے کم استعداد اخبار والوں نے بالکل دوسرے معنی میں چلا دیا ہے)، کی خود کار تلوار کند ہو کر رہ جائے گی۔

الہ آباد کے عارف شاعر نے کیسی پتے کی بات کہہ دی ہے ؎

ہر شیخ یہ کہتا ہے۔ عقائد ہیں تو یہ ہیں
توحید یہ کہتی ہے، زوائد ہیں تو یہ ہیں

(ہفتہ وار "صدق جدید" لکھنؤ)

۳۔ جون ۱۹۶۶ء

---

(۲)

اسلام زندگی کا ایک انقلاب آفریں تصوّر پیش کرتا ہے

ہماری ذہنی زندگی پر آج ایک خلا سا مستولی ہے۔ کیوں کہ ہمارا یہ عہد قحط الرجال کا عہد ہے، پختہ افکار رکھنے والے خال خال ملتے ہیں۔ ہمارا عہد جس نے ائتلاف (SYNTHESIS) کا ہم سے مطالبہ کر رہا ہے، ابھی تو اس نئے ائتلاف کی کہیں پرچھائیں بھی نظر نہیں آتیں۔

میں اسلام کی فکری تاریخ میں تغیر، حرکت اور ارتقاء کے موضوع پر مواد جمع کر رہا ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ یہ مواد خود قرآن کریم اور احادیث میں ملا ہے۔ قرآن مجید چوں کہ حیاتِ انسانی کی مثالی جدوجہد کا آئینہ دار اور رہنما ہے۔ لہٰذا اس میں حیات کے دل کی دھڑکن سب سے زیادہ تیز ہے۔ اور حقیقی بھی ہے۔ تصنع اور خطابت سے پاک۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی (APPROACH) مابعد الطبیعاتی نہیں۔ بلکہ واقعاتی ہے۔ اس کا مطمحِ نظر کائنات اور حیات کی محض تشریح کرنا نہیں، بلکہ اُسے بدلنا ہے، مابعد الطبیعاتی منطق فکری سکون پیدا کرتی ہے۔ اس لئے قرآن مجید نے اس کے بجائے واقعاتی منطق کے عمل اور انقلاب کی اپیل کو اپنایا ہے۔

یہ بات قطعاً غلط ہے کہ حقیقتِ اُولیٰ کی نقاب کشائی صرف مابعد الطبیعاتی طریق تحقیق ہی کر سکتا ہے، اگر ہم حقیقتِ اولیٰ کو تخلیق و ارتقاء کا مصدر تسلیم کر لیں تو مذکورہ تحقیق کے طریق کی کامیابی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ یہ طریقِ تحقیق ایک ایسے وجود کے متعلق ہی ہمیں معلومات بہم پہنچا سکتا ہے، جو فکر محض ہو، جس طرح ہندو فلسفہ میں ہستی کو حق (ست)، فکر (چت)، اور سکون (آنند) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

میرے خیال میں قرآن حکیم نے ہستی مطلق کو حق قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُسے فکر محض تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور فکر کو اس کی ایک قدر ذاتی قرار دیا ہے لیکن یہ فکر ہمہ وقت اس کے تخلیقی عمل میں اپنے آپ کو ڈھالتا رہتا ہے۔ اس لئے سکون اپنے روایتی معنوں میں ہستی مطلق کی قدر ذاتی نہیں بن سکتا۔ لہٰذا ایسی حقیقت اُولیٰ جو فعلیتِ مطلقہ کی شکل میں ہمارے سامنے آئے اور جس کی تخلیقی صلاحیتوں کی یہ حالت ہو کہ اگر تمام درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر روشنائی اور ایسی لاتعداد قلمیں اور سمندر ختم ہو

جائیں، مگر اُس کی اقدار کی تخلیق نہ ختم ہو تو ایسی ہستی یا فعلیت کے مطالعہ کے لئے ہمیں ایسے طریق کی ضرورت ہے، جو اُسے اُس کے عمل اور اس کی انقلاب آفرینی کے پس منظر میں رکھ کر اس کا مطالعہ کرسکے۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام کی اکثریت ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکی۔ حال ہی ڈاکٹر فضل الرحمان نے زکوٰۃ پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن پر حضرات علمأ کی طرف سے جو ردّ عمل ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہ بزرگ اس بات کو نہیں جانتے کہ وہ ایک ایسے عہد میں سانس لے رہے ہیں، جس میں وجود اور اُس کے مظاہر کی توجیہہ "زمان کی مقدار" کو جمع کئے بغیر ناممکن ہے، عمیق مطالعہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ زمانی بُعد دراصل باقی تینوں ابعاد کو بروئے کار لاتا ہے، یعنی اگر زمان نہیں تو طول، عرض وعمق کا وجود بھی نہیں ہو سکتا۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زمان کے دونوں پہلوؤں یعنی زمان متسلسل اور زمان خالص کو بیان فرمایا ہے۔ "لا تسبوا الدھر" والی حدیث اگر زمان متسلسل پر روشنی ڈالتی ہے، تو وہ حدیث جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ میرے اور اللہ کے درمیان ایسے لحات آتے ہیں، جن میں مُلک مقرب اور نبی مرسل بار نہیں پا سکتا" زمان خالص کے تصور کو ہمارے سامنے لاتی ہے، جو کتاب اور اس کی حامل شخصیت ایسے انقلاب آفریں تصورات کی مالک ہو، اُنہیں علمار کا اپنے جمود اور قدامت پسندی کے لئے سند بنانا کس قدر حیرت انگیز ہے۔

ہمارے اکثر علمار میں ایک انتہائی خطرناک روایت ترویج پا چکی ہے کہ وہ یوں تو قرآن مجید کی تمام آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب احادیث کو مانتے ہیں، مگر معاشرتی زندگی پر انہیں تطبیق کرنے سے جو منطقی نتائج مترتب ہوتے ہیں، انہیں تسلیم کرنے سے گریز فرماتے ہیں اور یہ شاید اس لئے کہ ان نتائج کے مان لینے سے، اُنھوں نے اپنی جو دنیا بنا رکھی ہے، اُس کے درہم برہم ہونے کا اُن کو ڈر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے زکوٰۃ کے متعلق اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، وہ کلی طور پر ٹھیک نہ بھی ہو، لیکن آخر اس میں کیا حرج ہے کہ زکوٰۃ جیسے اجتماعی عمل پر آج کے اجتماعی حالات کی روشنی

میں غور کیا جائے، ڈاکٹر صاحب نے زکوٰۃ کی فرضیت سے تو انکار نہیں کیا، البتہ اُنہوں نے اس کی حدود کو وسیع کرنے کی رائے دی ہے۔

زکوٰۃ کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے ردّ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے علمار مقدس صحائف کی تشریح وتعبیر تو ضرور کر سکتے ہیں، مگر اپنے تخلیقی عمل سے انہیں زندہ حقیقت میں نہیں بدل سکتے اور نہ وہ ماضی کے مقدس ورثے میں کسی قسم کا اضافہ کر سکتے ہیں، ہمارے یہ بزرگ اب تک یہ نہیں سمجھے کہ وجود اور اُس کے مظاہر زمان کی تخلیقی حرکت سے ہردم تجدد پذیر ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہی انقلاب آفریں تصورات کو پیش فرماکر اپنی دوامیت پر مہر ثبت کر دی ہے، انہیں تصوّرات کی مدد سے فارابی، ابن باجہ اور ابن طفیل نے یونانی فلسفہ پر تنقید کی اور بعد میں سپین کے راستے یہ تصورات ہیگل، برگساں اور آئن سٹائن تک پہنچ کر اپنی انتہائی مکمل شکل میں ظہور پذیر ہوئے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے ہزار اختلاف کے باوجود، اُنہوں نے ان سالوں میں جو بحثیں اُٹھائی ہیں، میں اُن کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس سے کم ازکم فکری جمود تو ٹوٹے گا، اور ہمارے علمار ان امور پر سوچنے کی زحمت کریں گے، جنہیں وہ حرفِ آخر سمجھ کر اطمینان سے بیٹھے ہوتے ہیں، اور یوں بھی ارشادِ ربانی ہے۔ قل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق، جب مختلف آرار کا آپس میں تصادم ہوتا ہے تو جو رائے مبنی برحق ہوتی ہے وہ غالب آتی ہے، اور جو باطل ہوتی ہے، وہ دَب کر رہ جاتی ہے۔

میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ہر رائے پر صاد نہیں کرتا، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اُنہوں نے سنت' حدود اور زکوٰۃ جیسے مسائل کے بارے میں بحث کا دروازہ کھول کر سب لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، یہ اُمتِ اسلامیہ کے حق میں اچھا ہے بُرا نہیں۔ آج سے آٹھ سو سال پہلے کے بغداد اور دو سو سال پہلے کی دہلی میں علمی و دینی بحثوں کے لئے اس قسم کی آزاد فضا تھی، جس نے امام غزالی اور امام ولی اللہ جیسے مجددینِ ملت کو پروان چڑھایا، علمی بحث سے زندقہ نہیں پھیلتا، یہ جمود ہوتا ہے جو زندقہ کی شکل میں آخر کار پھٹتا ہے۔

آپ کو یاد دلاؤں، آپ ہی کے رسالے "فکر و نظر" میں جو رابطۃ العالم الاسلامی نمبر تھا۔

جناب احمد زکی یمانی وزیر پٹرول و معدنیات مملکتِ سعودی عرب کا ایک مقالہ "عدل اجتماعی اور اس کی اسلامی بنیادیں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اُس میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"زکوٰۃ کہاں کہاں خرچ ہو، قرآن مجید نے ان مصارف کی یوں وضاحت کی ہے:۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ (بے شک صدقات تو صرف حق ہے غریبوں اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان پر متعین ہیں اور جن کی دل جوئی کرنا ہے، اور گردنیں چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضے میں اور جہاد میں اور مسافروں میں)

" یہ ایک امر مسلّم ہے کہ زکوٰۃ کے بعض مصارف اب ختم ہو گئے ہیں، جہاں تک "مولفۃ قلوبھم" کا تعلق ہے، حضرت عمر کے عہدِ خلافت سے انہیں زکوٰۃ سے حصہ نہیں دیا جا رہا۔ "فی الرقاب" یعنی غلاموں کا قصہ اب پُرانا ہو گیا ہے، اس کی حیثیت محض تاریخی رہ گئی ہے، اور غلام سرے سے رہے نہیں، رہے "العاملین علیھا" یعنی زکوٰۃ کی تحصیل کا کام کرنے والے، تو وہ اب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور سرکاری خزانے سے ان کو تنخواہ ملتی ہے، اس لئے ان پر زکوٰۃ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے اب زکوٰۃ کی ساری رقم بیت المال میں جائے گی تاکہ اس سے کفالتِ اجتماعی کی ضرورتیں پوری ہوں"

یہ سعودی حکومت کے، جو کافی حد تک قدامت پسند ہے، ایک ذمہ دار وزیر کی رائے ہے، جس کا اُس نے ایک عالمی اجتماع میں اظہار کیا۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے نفسِ زکوٰۃ کو ایک عمومی ٹیکس قرار دیا ہے، جو ایک اسلامی حکومت اپنے عوام سے وصول کرنے کی مجاز ہے۔ اس مسئلے پر بحث ہو سکتی ہے، اور ہونی چاہیئے، اس پر بھڑک اُٹھنا علمی تحقیق سے بعید ہے۔

والسلام

الطاف جاوید

مارٹن روڈ، کراچی۔